نقطۂ نظر

کیا اولاد کی کثرت شرعی حکم ہے؟

تحریر: جناب محمد اسلم، اسسٹنٹ پروفیسر، ساہیوال

نوٹ: کثرتِ اولاد کا مسئلہ اہل علم میں ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں فاضل مضمون نگار نے مدلل انداز سے اولاد کی کثرت "کوئی شرعی حکم نہ ہونے" کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اگر کوئی صاحبِ علم اس خیال سے اختلاف رکھتے ہوں اور دلائل سے دوسرا موقف پیش کرنا چاہتے ہوں تو "منہاج" کے صفحات اس کے لئے بھی حاضر ہیں۔ مدیر

اولاد کا وجود ایک فطری جذبہ ہے۔ شخصی، قومی اور ملی ضرورت ہے۔ میاں بیوی کے رشتہ ازدواج کے استحکام کا ذریعہ اور پھر ان کے مستقبل کا سہارا بھی ہوسکتا ہے۔ مگر یہ فطری خواہش دو تین بچوں کی متقاضی ہے۔ کثرت کی طالب نہیں۔ مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور دعا فرماتے ہیں۔ اے میرے رب مجھے فرزند عطا کر، جو میرا اور آلِ یعقوب کا وارث بنے (۱)

اس دعا میں حضرت زکریا علیہ السلام نے ایک بچے کی خواہش کی، ہاں اگر بیویاں زیادہ ہوں تو ہر بیوی کی خواہش اور ضرورت ہوگی۔ اس طرح ایک مرد کثیر الازواج ہونے کی بنا پر کثیر الاولاد بن جائے گا۔ مگر یہ ایک دوسری صورت ہوگی۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں (۲) حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں (۳) اس بنا پر آپ کے کثیر الاولاد بھی تھے۔ نیز اولاد کی یہ کثرت اس لئے بھی حجت نہیں۔ کیونکہ وہ باہمی طور پر حاسد اور سازشی تھے۔ حتیٰ کہ والد کے ساتھ بھی ان کا سلوک نامناسب تھا (۴)

اس میں بھی شک نہیں کہ اولادِ نرینہ کا حصول بھی فطری خواہش ہے۔ بعض اوقات انسان اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کے ہاں مسلسل لڑکیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں اس طرح وہ کثیر العیال بن جاتا ہے۔ مگر یہ بھی دوسرا معاملہ ہے اور موضوع سے خارج ہے۔

نرینہ اولاد کی خواہش قدیم زمانہ میں شدید تھی۔ کیونکہ وہ قبائلی نظام تھا۔ جس میں افراد کی کثرت ہی قبیلہ کی عظمت و قوت کا سرچشمہ ہوتی۔ ایک شخص کے جتنے زیادہ بیٹے ہوتے وہ شخص اتنا ہی زیادہ مقتدر اور معزز ہوتا۔ مگر موجودہ زمانہ میں یہ ضرورت ختم ہوچکی ہے۔ یعنی قبائلی معاشرے کی جگہ منظم حکومتیں وجود میں آگئیں ہیں اور وہی طاقت کا مرکز ہیں۔

کثرت اولاد کے عنوان پر شرعی نقطہ نظر معلوم کرنے کیلئے جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو کہیں بھی یہ حکم نہیں ملتا کہ اولاد کثرت سے پیدا کرو۔ یا نسل انسانی میں خوب اضافہ کرو۔ البتہ اولاد کی دنیوی حیثیت کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر موجود ہے۔ مثلاً:

"المال والبنون زينة الحيوة الدنيا"(۵) (مال واولاد دنیوی زندگی کی زینت ہے)

اسی طرح فرمان الٰہی ہے:

"انما اموالكم واولادكم فتنه"(٦)

(بلاشبہ تمہارا اموال و اولاد فتنے کا باعث ہیں) وغیرہ۔ اس قسم کی آیات کے ذریعہ مال واولاد سے احتراز کا مفہوم تو مترشح ہوتا ہے۔ مگر ترغیب کا پہلو نہیں نکلتا۔

اولاد کی پیدائش کا بنیادی تعلق زوجہ یعنی بیوی کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت حوا کے متعلق فرمایا:

"وخلق منها زوجها ليسكن اليها"(۷)

(اس کی بیوی پیدا کی تاکہ وہ (آدم) اس سے سکون حاصل کرے۔)

اسی طرح عام لوگوں کے متعلق فرمایا:

"وخلق لكم من انفسكم ازواجا لتسكنوا اليها وجعل بينكم مودة ورحمة"(۸)

(تمہارے لئے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت ورحمت بنائی۔)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ عورت کی تخلیق کا مقصد سکون کا حصول اور محبت والفت کا قیام ہے نہ کہ اولاد وغیرہ۔ ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کے متعلق قرآن مجید کا پیش کردہ تصور کتنا بلند ہے کہ ہندو مذہب کی طرح بیوی بچے جننے کی مشین نہیں بلکہ محبت کا گہوارہ ہے۔

بعض لوگوں نے قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت سے کثرت اولاد پر استدلال کیا ہے:

"نساءكم حرث لكم فاتوا حرثكم انى شئتم"(۹)

(تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتیاں ہیں۔ سو تم اپنی کھیتیوں کے پاس آؤ جس طرح چاہو یعنی جس طرح کھیت کا مقصد فصل پیدا کرنا ہے اسی طرح عورت کا مقصد بھی اولاد کا حصول ہے۔)

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ شان نزول کے اعتبار سے یہ آیت یہود کے غلط نظریہ کی تردید کیلئے نازل ہوئی۔ یہود عورت کی پشت کی طرف سے ہو کر وطی کرنے کو ممنوع خیال کرتے اور کہا کرتے کہ اس

سے بچہ احول (بھینگا) پیدا ہوتا ہے آپ سے پوچھا گیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی یعنی تمہاری عورتیں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں۔ جس سے نطفہ بجائے تخم اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے۔ اس سے مقصود اصلی صرف نسل کا باقی رکھنا اور اولاد کا پیدا کرنا ہے۔ سو تم کو اختیار ہے آگے سے یا کروٹ سے یا پشت سے۔ جس طرح چاہو مجامعت کرو۔ مگر لواطت ہرگز نہ ہو" (۱۰)

معلوم ہوا کہ اس آیت کا مفہوم ومقصد بھی بقائے نسل کی حد تک ہے۔ کیونکہ یہ ایک فطری ضرورت ہے اور کثرت اولاد کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں مذکور فعل امر کا صیغہ وجوب کیلئے نہیں بلکہ محض اباحت اور جواز کیلئے ہے۔ لہذا کثرت اولاد کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔

شریعت کے دوسرے ماخذ یعنی حدیث میں بھی کثرت اولاد کا حکم موجود نہیں۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

"یامعشرالشباب من استطاع منکم الباءۃ فلینکح فانه اغض للبصر واحصن للفرج (۱۱)"

(اے نوجوانو! تم میں سے جو نکاح کرسکے وہ ضرور کرے کیونکہ اس سے آنکھوں میں شرم اور جنسی خواہشات میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے نکاح کا اولین مقصد عفت وپاک دامنی بتلایا ہے۔ اولاد کی کثرت تو ایک طرف، اولاد کی پیدائش کا اشارہ تک موجود نہیں۔

بحث نمبر ۲

اولاد کا وجود بلاشبہ نعمت ہے مگر اکیلی اولاد نہیں بلکہ مال کے ساتھ۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے مختلف مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے، مثلاً:

"ثم رددنالکم الکرۃ وامددناکم باموال وبنین" (۱۲)

(پھر ہم نے تمہارا غلبہ واپس کیا اور تمہارے اموال واولاد میں اضافہ کیا۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بشارت دی اگر تم اللہ سے ڈروگے اور میری اطاعت کروگے تو یمددکم باموال وبنین (۱۳) تمہارے اموال اور اولاد میں اضافہ ہوگا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ حضور علیہ السلام کے پاس آئیں اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کیلئے دعا کی درخواست کی۔ آپ علیہ السلام نے یہ الفاظ کہے:

"اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیما اعطیناہ"(۱۴)

(اے اللہ! اس کا مال اور اولاد زیادہ کر اور جو کچھ ہم نے اسے دیا ہے اس میں برکت فرما۔

قرآن وحدیث کے مندرجہ بالا حوالہ جات میں مال کا ذکر پہلے اور اولاد کا ذکر بعد میں ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد نعمت ہے بشرطیکہ پہلے مال ہو۔ ورنہ تنگ دستی وغربت تو کفر کے برابر ہے۔ حضور علیہ السلام کی دعا ہے:

"اللھم انی اعوذ بک من الکفر والفقر ، فقال رجل ویعدلان ، قال نعم"(۱۵)

(اے اللہ! میں کفر اور تنگدستی سے پناہ مانگتا ہوں۔ ایک شخص نے کہا کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ دوسری دعا ہے:

"اعوذ بک من فتنۃ الفقر"(۱۶)(میں فقر کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں)

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ تنگ دستی بہت بڑی مصیبت ہے۔ پھر اکیلا شخص تو تنگ دستی میں شاید گزارہ کر لے۔ لیکن اگر وہ عیال دار بھی ہو تو خطرہ ہوگا کہ مالی پریشانیوں سے گھبرا کر کہیں وہ خودکشی یا کفریہ کلمات کا ارتکاب نہ کر لے۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ مال کے حصول کی ترغیب ہے اور اسے فضل کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

"فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ(۱۷)زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو) دوسری جگہ مال سے محرومی یعنی بھوک کو عذاب قرار دیا ہے۔ مثلاً فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون"(۱۸)(اللہ نے ان کے اعمال کی وجہ سے انہیں بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا۔ نیز ارشاد ہے:" لھم مغفرۃ ورزق کریم"(۱۹)ان کے لئے مغفرت اور عمدہ رزق ہے۔ اس آیت میں اللہ نے رزق یعنی مال کو مغفرت کے ساتھ ملایا اور دونوں کو یکساں درجہ کی نعمت قرار دیا۔

ان تمام آیات سے مال کی قدر وقیمت اور رزق کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ جبکہ اولاد کے متعلق اس قسم کا انداز بیان کہیں بھی موجود نہیں۔ اس طرح ہم مال اور اولاد کا باہمی موازنہ کر سکتے ہیں اور شرعی اعتبار سے انکا درجہ بھی متعین کر سکتے ہیں کہ مال کی اہمیت زیادہ ہے یا اولاد کی۔

مال اور اولاد کی باہمی نسبت سے ہم چار اقسام بنا سکتے ہیں۔ (۱) مال اور اولاد دونوں کی کثرت ہو۔ یہ صورت اطمینان بخش ہے (۲)مال اور اولاد دونوں کی قلت ہو۔ یہ صورت ہماری بحث سے خارج ہے۔ (۳)مال کی کثرت اور اولاد کی قلت ہو۔ ایسے وقت میں گھر میں خوشحالی ہوگی۔ (۴) مال کی قلت اور اولاد

کی کثرت ہو۔ یہ ایک سنگین صورت ہوتی ہے۔ لہذا اس پر تفصیل سے بحث کی جاتی ہے۔ قرآن وحدیث اور سلف صالحین کا نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے چار شادیوں تک کی اجازت دی اور فرمایا اگر تمہیں خوف ہو کہ انصاف قائم نہ کرسکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔ پھر ارشاد فرمایا:

"ذالک ادنیٰ ان لاتعولوا (۲۰) امام رازی اس کی تفسیر لکھتے ہیں "ان لاتکثر عیالکم" یعنی تمہارا گھرانہ بڑا نہ ہو کیونکہ جس کا گھرانہ بڑا ہوجاتا ہے اسے نگرانی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تقویٰ، کسب حلال اور پاکیزہ رزق کی فراہمی میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام شافعی کی تفسیر (عیال زیادہ نہ ہو) نہایت عمدہ ہے۔ (۲۱)

اس عبارت میں امام رازی نے امام شافعی کی تفسیر کی تصحیح و تحسین کی ہے۔ اس تفسیر سے واضح ہوا کہ کثرت عیال سے بچنے کی کوشش کرنا درست ہے۔

بعض لوگوں نے امام شافعی کی تفسیر پر لغوی اعتبار سے اعتراض کیا تھا۔ امام رازی نے اس کا جواب دیا۔ اس طرح امام شافعی کی تفسیر بے داغ ہو گئی۔ اس نظریہ کے خلاف امام رازی نے کسی کا قول نقل نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ متفق علیہ ہے۔

۲۔ حدیث میں منقول حضور ﷺ کی دعائیں بھی اس موقف کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً: اللھم انی اعوذبک من جھد البلاء ودرک الشقاء" (۲۲) (اے اللہ! میں مصیبت کی سختی اور بدبختی کی گرفت سے پناہ مانگتا ہوں۔ حضرت ابن عمرؓ کی تفسیر کے مطابق جھد البلاء کا مطلب ہے قلۃ المال وکثرۃ العیال" یعنی مال کی قلت اور عیال کی کثرت۔ دوسری تفسیر کے مطابق وہ سخت حالت مراد ہے جس میں انسان موت کو پسند کرنے لگتا ہے (۲۳) ظاہر ہے کہ یہ حالت بھی پہلی کیفیت کا رد عمل ہے۔ یعنی جب انسان اپنے گھریلو مسائل سے تنگ آکر موت کو دعوت دینے لگتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال کی قلت اور عیال کی کثرت ایک سنگین مسئلہ ہے۔ جس سے آپ ﷺ بھی پناہ مانگا کرتے تھے۔ پھر عام انسان اس کیفیت کا متحمل کس طرح ہوسکتا ہے۔

مندرجہ بالا تشریح گو حضور ﷺ سے منقول نہیں مگر اس کی تائید دیگر احادیث سے ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کی دعا ہے۔ اللھم انی اعوذبک من القلۃ والفقر" (۲۴) (اے اللہ! میں مال کی قلت اور تنگ دستی سے تیری پناہ مانگتا ہوں)

۳۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حضور ﷺ کے ماموں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ جنگ قادسیہ کے موقعہ پر آپ مسلم افواج کے سپہ سالار تھے۔ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت ابوسعدہ نامی ایک شخص

نے اعتراض کیا۔ آپ نے اس شخص پر بددعا کی۔ اے اللہ اگر اس شخص نے یہ بات جھوٹ، ریاکاری اور شہرت کیلئے کہی ہے، تو تو اس کو اندھا کر، اس کے اہل وعیال کو زیادہ کر، اسے فتنوں کی گمراہیوں کا نشانہ بنا۔ وہ شخص اندھا ہوگیا۔ اس کی دس بیٹیاں ہوئیں وہ عورتوں کو چھیڑتا تھا۔(۲۵)

معلوم ہوا کہ اہل وعیال کی کثرت ایک ایسی برائی تھی کہ صحابہ کرامؓ اور عوام اس سے آگاہ تھے۔ کیونکہ بددعا کسی بڑی اور مسلہ برائی سے دی جاتی ہے۔

مضمون کی تائید میں امام غزالی کے نقل کردہ دو اقوال بھی قابل ذکر ہیں۔ (۱) جب اللہ کسی شخص کیلئے برائی کا ارادہ کرتا ہے تو دنیا میں اس پر عیال (اولاد) کی شکل میں دانت مسلط کردیتا ہے۔ جو اس کا گوشت نوچتے ہیں (۲۶) (۲) عیال کی قلت ایک آسانی ہے اور اس کی کثرت ایک محتاجی ہے (۲۷) پہلے قول سے معلوم ہوا کہ عیال خدائی آفت ہے اور دوسرے قول سے معلوم ہوا کہ عیال کی کثرت سے انسان غریب ہوجاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ عیال کی کثرت سے بچنا چاہیے۔

شرعی نقطہ نظر سے ہٹ کر عمومی اعتبار سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی معاملات ہوں یا دینی ہر جگہ میانہ روی کو پسند کیا جاتا ہے۔ شریعت نے تو عبادات میں بھی کثرت کو پسند نہیں کیا۔ مثلاً حضور ﷺ نے اپنے اصحاب کو روزوں کی کثرت سے منع کیا۔ تمام رات عبادت کرنے سے روکا (۲۸) کثرت صدقہ سے گریز کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا خیر الصدقۃ ماکان عن ظھر غنی" (۲۹) بہتر صدقہ وہ ہے جس میں اپنی تونگری ملحوظ رہے جس مذہب میں عبادات کے متعلق یہ تعلیم ہو وہاں کیونکر ممکن ہے کہ عیال کے معاملے میں کثرت کا حکم دیا جائے۔ کثرت کا یہ منفی پہلو قرآن مجید میں بھی جابجا نظر آتا ہے۔ مثلاً الھکم التکاثر" (۳۰) مال و دولت کی کثرت نے تمہیں غافل کئے رکھا۔ اذا اعجتکم کثرتکم" (۳۱) جب تمہاری کثرت تمہیں بھلی لگی۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ کسی بھی چیز کی کثرت اچھی نہیں۔

بحث نمبر ۳

اولاد کی پیدائش ایک فطری نظام ہے۔ کیا اس نظام میں رکاوٹ ڈالی جاسکتی ہے؟ نیز اولاد کی کثرت سے بچاؤ کا کوئی طریقہ ہے؟ ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ عیال کی کثرت سے بچنے کا سادہ اور آسان طریقہ عزل ہے۔ یہ عزل گزشتہ زمانے میں نسبتاً مشکل تھا۔ مگر موجودہ زمانے میں سائنسی ترقی نے جس طرح زندگی کے دیگر شعبوں میں آسانیاں پیدا کی ہیں وہاں عزل کیلئے بھی آسان طریقہ مہیا کیا ہے جو کہ فطری طریقہ کے بھی قریب ہے۔

جہاں تک عزل کا تعلق ہے تو اس کا جواز تقریباً متفق علیہ ہے کیونکہ یہ متعدد احادیث سے ثابت ہے۔ مثلاً حضرت جابرؓ سے روایت ہے "کنا نعزل علی عھد النبی والقرآن ینزل" (۳۲) حضور علیہ السلام کے

زمانہ میں ہم عزل کرتے تھے اور قرآن نازل ہورہا تھا۔

یہ روایت متعدد وجوہ سے فکر انگیز ہے(۱)اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عزل ایک دو افراد کا نہیں بلکہ اجتماعی عمل تھا۔ کیونکہ اس روایت میں جمع کا صیغہ ہے۔ (۲)حدیث کا پہلا جملہ فعل ماضی استمراری ہے۔ جو اس عمل کے دوام کو ظاہر کرتا ہے۔(۳)اس روایت کے دوسرے جملے سے عزل کے ٹھوس جواز کا اظہار ہوتا ہے کہ چونکہ وہ زمانہ احکام کے نزول کا زمانہ تھا۔ مگر حرمت کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عزل بالکل جائز ہے۔

اسی قسم کی دوسری روایت ہے:

اصبناسبيا فكنانعزل فسالنارسول اللهصلى اللهعليه وسلم فقال او انكم تفعلون قالها ثلاثا ثم قال مامن نسمة كائنة الى يوم القيامة الا هى كائنته(۳۳)

(ہمیں کچھ لونڈیاں حاصل ہوئیں۔ ہم عزل کرنے لگے۔ پھر ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو آپ نے کہا کیا تم یہ کام کرتے ہو! یہ بات آپ نے تین مرتبہ کہی۔ پھر کہا جس ذی روح نے روز قیامت تک آنا ہے وہ آکر ہی رہے گی۔)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے عزل کے عمل پر حیرانی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ مگر آپ ﷺ نے کھل کر اس کی ممانعت یا کراہت کو بیان نہیں کیا۔ اسی لئے بعض صحابہ نے اس قسم کی روایات سے عزل کے خلاف اولی ہونے پر استدلال کیا ہے اور اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ حافظ ابن قیم کی تحقیق کے مطابق دس صحابہ، امام مالک، امام شافعی، اہل کوفہ اور جمہور اہل علم، عزل کے جواز کے قائل ہیں۔ البتہ ایک چھوٹی سی جماعت اسے خلاف اولی سمجھتی ہے(۳۴)

امام شوکانی کے بیان کے مطابق عزل کے تین محرکات ہیں(۱) دودھ بگڑ جانے کے خوف سے، دودھ پینے والے چھوٹے بچے کی صحت کو خطرہ۔ (۲) جنگ میں حاصل شدہ عورتوں سے عزل کرنا تاکہ ان سے اولاد نہ ہو(۳) کثرت عیال سے گریز(۳۵)

معلوم ہوا کہ کثرت عیال سے بچنے کی کوشش بذات خود ایک جائز مقصد ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ شخص مال دار ہے یا غریب ہے۔ مندرجہ بالا روایات کا تعلق عزل کے جواز کے ساتھ ہے۔ جبکہ فقہاء تو اس سے بھی آگے تک کہتے ہیں۔ مثلاً:

"العزل ليس بمكروه برضاالمراة الحرة.. وكذالك امراة يسعهاان تعالج لاسقاط الحمل مالم يستبن منه شئى من خلقه وذالك مالم يتم له ماة وعشرون يوما(۳۶)

(آزاد عورت کی رضامندی کے ساتھ عزل کرنا مکروہ نہیں۔ اسی طرح عورت کیلئے اجازت ہے کہ وہ حمل ضائع کرنے کیلئے دوائی استعمال کرے۔ جب تک کہ حمل کی خلقت واضح نہ ہو۔ اور اس کی مدت ایک سو بیس دن ہے۔ اس طرح جب فقہاء نے عزل سے اگلے مرحلے یعنی حمل کے اسقاط کی مشروط اجازت دیدی تو پھر پہلے قدم یعنی عزل کے جواز یا کراہیت سے بحث کرنا سرے سے بے معنی ہوجاتا ہے۔

عزل کے سلسلے میں ایک اعتراض یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اسے وأد خفی قرار دیا ہے لہذا یہ ممنوع ہے۔ جیسا کہ جدامہ بنت وہب کی روایت سے واضح ہوتا ہے(۳۷) جواب یہ ہے کہ حضرت جابر کی روایت میں اسے یہود کا قول قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً:

"عن جابر قال قلنا یارسول اللّٰہصلی اللّٰہعلیہ وسلم انا کنا نعزل فزعمت الیھود انہ الموؤدۃ الصغری فقال کذبت الیھودان اللّٰہاذا اراد ان یخلقہ لم یمنعہ شئی(۳۸)

(حضرت جابر سے منقول ہے کہ ہم نے کہا اے اللہ کے رسول ! ہم لوگ عزل کرتے تھے۔ یہود نے اسے وأد صغری قرار دیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا یہود نے جھوٹ بولا۔ اللہ تعالی جب کسی کو پیدا کرنے کا ارادہ کرلے تو اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔

چونکہ وأد کے سلسلے میں یہ دونوں روایات مضطرب ہیں اس لئے ناقابل استدلال ہیں۔ نیز معنوی اعتبار سے غور کریں تو واد کا مفہوم اس جگہ منطبق نہیں ہوتا۔ کیونکہ وأد کا معنی ہے زندہ لڑکی کو درگور کرنا۔ عزل کے وقت مادہ تولید کو باہر پھینکا جاتا ہے۔ اس مادے پر زندہ درگور کا اطلاق ہی صحیح نہیں۔ پھر اس مادہ سے لڑکی ہونا بھی یقینی نہیں تو ایسی صورت میں وأد کا اطلاق ہی درست نہیں۔

محسوسات میں دیکھیں تو کسی بھی چیز پر حکم اس کی موجودہ حیثیت وحالت پر نافذ ہوتا ہے نہ کہ اس کی آئندہ حالت پر۔ مثلاً کوئی شخص دوسرے انسان کی ایک کلو گندم ضائع کردے تو اس کا یہ مطلب لینا درست نہیں ہوگا کہ اس سے پانچ من گندم پیدا ہوسکتی تھی لہذا پانچ من گندم کی قیمت ادا کرے۔ یہ انداز فکر یہود جیسی ساہوکار قوم کا تو ہوسکتا ہے کسی اور کا نہیں۔ لہذا عزل کو واد خفی قرار دینا یہودی انداز فکر ہی کی عکاسی ہے۔

مندرجہ بالا احادیث میں عزل کرنے پر حضور ﷺ کے یہ الفاظ "ان اللّٰہاذا اراد ان یخلقہ لم یمنعہ شی" کا مطلب اس عمل پر کراہت کا اظہار نہیں بلکہ اس کا مقصد عقیدے کی اصلاح ہے یعنی خدا کی قدرت پر یقین کامل کہ وہ جہاں چاہے جس طرح چاہے تخلیق کرے۔ یہ اس کے اختیار میں ہے۔ گو عملی طور پر رحم سے باہر زندگی وجود میں آنے کا کوئی واقعہ رونما ہوا ہے اور نہ ہی مستقبل میں ہوگا۔ کیونکہ خدائی نظام

باقاعدہ اسباب اور معینہ قواعد کے تحت چل رہا ہے۔

تاہم اس میں شک نہیں کہ بعض صحابہ اور دیگر علماء نے اس پر کراہت کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً مفتی محمد شفیع مرحوم کراچی نے اس تمام بحث کا خلاصہ یہ پیش کیا ہے۔ ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عمل کی ہمت افزائی تو کہیں نہیں فرمائی بلکہ ناپسندیدگی یا فضول ہونے کا اظہار کیا۔ البتہ واضح طور پر اس عمل کی مخالفت بھی نہیں کی۔ تو اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ یہ عمل جائز مگر مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ (۳۹) اس مکروہ سے مراد تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی ہوگا۔ کیونکہ اس کے ساتھ جائز کا لفظ بھی ہے۔ بہرحال عزل، بطور فیشن، آسائش، مغربی پروپیگنڈے یا ذہنی مرعوبیت کی بناء پر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ذاتی قومی اور ملکی ضرورت ووسائل کے تحت کرنا چاہیے کیونکہ ایک تو یہ عمل نظام فطرت کے خلاف ہے۔ دوسرے بعض علماء کے نزدیک مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔

بحث نمبر ۳

کثرت اولاد کی ممانعت میں چند دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان کے متعلق بھی تفصیلی بحث کی جائے۔ پہلی دلیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ولاتقتلوااولادکم خشیۃ املاق" (۴۰) (غربت کے خوف سے اولاد کو قتل نہ کرو)

یعنی کثرت اولاد کے خوف سے کوئی احتیاطی اقدام یا انسدادی تدبیر اختیار کرنا بھی قتل اولاد کے مترادف ہے۔ لہذا عزل وغیرہ کا کوئی اقدام کرنا درست نہیں۔

جواب بالکل واضح ہے کہ قتل کا مطلب ہوتا ہے کسی ذی روح جسم کا خاتمہ کرنا۔ جس جگہ روح نہیں وہاں قتل کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔ جیسے کھجور کی گٹھلی ضائع کرنے پر درخت کاٹنے کا حکم نافذ نہیں ہوتا۔ اسی طرح مادہ منویہ کے ضائع کرنے پر بھی قتل کا حکم جاری نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک قتل اولاد کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اسلام سے قبل عرب و عجم میں قتل اولاد کے مختلف مقاصد اور مختلف طریقے تھے۔ پہلا مقصد جو عرب میں عام مروج تھا، یہ کہ وہ اپنی نومولود بچی کو افلاس وغربت کے خوف یا موہومہ افلاس کی بنیاد پر زندہ درگور کردیتے۔ بعض اوقات بچی کو دوسرے گھر کی بہو بننے اور داماد کی ماتحتی کرنے میں اپنی عار سمجھتے۔ اس لئے بچی کا خاتمہ کردیتے۔

۲۔ نذر کا طریقہ۔ ارشاد باری تعالیٰ "قتل اولادھم شرکاؤھم" (۴۱) کی تفسیر میں امام رازی لکھتے ہیں۔ جاہلی دور میں کوئی شخص کھڑے ہو کر قسم اٹھاتا کہ اگر اس کے ہاں اتنے بیٹے ہوئے تو وہ ان میں سے

ایک کو اللہ کی راہ میں قربان کردے گا۔ جیسا کہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کے متعلق قسم کھائی تھی(۴۲)

امام رازی نے یہ تفسیر صرف عرب کے حوالے سے کی ہے جبکہ اولاد کی قربانی کا یہ طریقہ دیگر ملکوں اور قوموں میں بھی موجود تھا۔ مثلاً حقانی صاحب اسی آیت کی تشریح میں رقم طراز ہیں۔ اپنے فرضی معبودوں سے اولاد کا سوال کرتے اور جب کئی اولاد ہوتی تو ان میں سے ایک کو بت خانہ کے پاس لے جا کر اسی بت کے نام سے ذبح کرتے۔ جس طرح کہ ہنود بتوں پر جانوروں کی بھینٹ چڑھاتے ہیں اور یہ رسم بابل نینوی میں بھی تھی۔ ہنود میں بھی یہ رسم ہے(۴۳)

۳۔ اس قسم کا تعلق بھی باطل معبودوں کی خوشنودی کے ساتھ تھا۔ قدیم زمانہ میں انسان کی خوراک کا انحصار بارشوں اور دریاؤں کی روانی پر تھا۔ پھر ان بارشوں اور دریاؤں کو کسی خاص ستارے یا بت سے منسوب کرتے اور اس کے زیر انتظام سمجھتے۔ مثلاً بارش کا دیوتا، دریا کا دیوتا۔ ان دیوتاؤں کی خوشنودی کیلئے سالانہ قربانی دی جاتی۔ اس قسم کی ایک رسم کا ذکر حضرت عمرو بن العاص نے فتح مصر کے وقت کیا تھا۔ کہ اہل مصر دریائے نیل کے دیوتا کی خوشنودی کیلئے ایک دوشیزہ کو دریا کی بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اگر یہ رسم ادا نہ کی جائے تو دریا میں پانی کی روانی ختم ہوجاتی ہے جس کے نتیجہ میں ان کی زراعت ختم ہوجائے گی اور قحط برپا ہوجائے گا(۴۴)

ان مندرجہ بالا اقسام میں سے پہلی قسم میں ایک معصوم جان کا قتل ہے۔ نیز مستقبل کی غربت کا خوف ایک توہم پرستی ہے۔ دوسری اور تیسری اقسام میں قتل کے علاوہ شرک بھی ہے۔ کہ غیر اللہ کی خوشنودی کیلئے قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا جائے۔ اس طرح دوہرے جرم کی وجہ سے اس کی حرمت مزید بڑھ جاتی ہے جبکہ عزل کے ساتھ ان اوصاف کا کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس جگہ جسم ہے نہ روح، قتل ہے نہ شرک۔ لہذا اس بحث کا موضوع کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

دلیل نمبر۲ بعض افراد کا نظریہ ہے کہ جب رزق کی ذمہ داری اللہ تعالی کے سپرد ہے تو پھر کثرت اولاد سے گھبرانے اور رزق کی فراہمی سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس مقصد کیلئے وہ سابقہ آیت کے دوسرے حصے سے استدلال کرتے ہیں یعنی نحن نرزقکم وایاھم(۴۵) ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں)

جواب یہ ہے کہ ہر کام کیلئے حقیقی فاعل تو اللہ تعالی ہی ہے اور جس طرح وہ رزق عطا کرنے والا ہے اسی طرح اولاد دینے والا بھی ہے۔ جب بے اولاد جوڑا، اولاد کے حصول کیلئے کوشش کرتا ہے اور اس

سے خدا کی قدرت پر عدم اعتماد لازم نہیں آتا۔ تو پھر رزق کے حصول کی کوشش سے اللہ کی شانِ رزاقیت پر اعتراض کیسے لازم آسکتا ہے۔ شاید ان لوگوں نے خود ساختہ تقسیم قائم کرلی ہے کہ ان کا کام بچے پیدا کرنا ہے اور اللہ کا کام رزق مہیا کرنا ہے۔

نیز اگر رزق کی فراہمی صرف اللہ پر ڈال دی جائے تو پھر انسان غیر مکلف ہوجاتا ہے اور تشریعی جہاں سے نکل کر تکوینی جہاں کا حصہ بن جاتا ہے کہ وہ محض خدائی تقدیر کے رحم و کرم پر ہے، شجر و حجر کی طرح مجبور محض ہے۔ برصغیر کے مخصوص راہبانہ ماحول کی وجہ سے یہاں کے لوگ اس قسم کا خاصا میلان رکھتے ہیں۔ اپنی کم ہمتی و بے تدبیری کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر صابر و قانع ہو بیٹھتے ہیں۔ اپنی غلطیوں اور ناکامیوں کی وجوہات تلاش کرنے کی بجائے معجزات اور کرامتوں کے ظہور کا انتظار کرتے ہیں۔ مادی اسباب و علل کو توکل کے منافی قرار دیتے ہیں اور اسی کو اصل مذہب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حضرت انسؓ کی روایت کے مطابق حضور علیہ السلام نے توکل کی تشریح یہ کی تھی کہ پہلے اونٹ کا پاؤں باندھو۔ پھر توکل کرو(۴۶) یعنی اسباب اختیار کرنا پہلے نمبر پر اور توکل دوسرے نمبر پر ہے۔

جہاں تک رزق کی فراہمی کا تعلق ہے تو اس کے تین درجے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **واللہ خیر الرازقین**" (۴۷) اللہ بہتر رزق دینے والا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ رازق کئی ہیں اور بہتر رازق اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ کے رازق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے رزق کے اسباب و وسائل زمین و آسمان میں رکھ دیئے ہیں(۴۸) ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا انسانوں کی ذمہ داری ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ کھانا تیار ہو کر دستر خوان پر سج کر انسان کے سامنے آجائے گا۔ اس قسم کا کوئی واقعہ اگر رونما ہوا ہے تو وہ نمونہ نہیں بلکہ محض خدا کی قدرت کا اظہار ہے۔

دوسرے درجہ پر ہر شخص انفرادی طور پر ذمہ دار ہے۔ مثلاً والدین اپنے بچوں کیلئے، خاوند اپنی بیوی کیلئے، جوان اولاد اپنے بوڑھے والدین کیلئے۔ اگر یہ لوگ نفقہ مہیا نہ کریں تو قانوناً مجرم ہونگے اور حکومت وقت ان کی سرزنش کرے گی۔ اس سلسلے میں حضور علیہ السلام کی ذات ہمارے لئے نمونہ ہے کہ فتح خیبر کے بعد آپ اپنی بیویوں کیلئے سال بھر کا خرچہ رکھ لیتے تھے(۴۹) اسی طرح ماں اپنے بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ دار ہے۔ اگر وہ بچہ دودھ نہ ملنے کی وجہ سے فوت ہوجاتا ہے تو اس کا الزام اللہ تعالیٰ یا کسی اور پر نہیں۔ اللہ کے رازق ہونے کا مطلب اس جگہ اسی قدر ہے کہ اس نے ماں کے سینے میں دودھ کا چشمہ جاری کردیا۔

اس سلسلے میں حضور علیہ السلام کی ایک روایت ملاحظہ ہو۔ حضرت عامر بن سعد سے منقول ہے کہ ان کے والد شدت مرض کی وجہ سے زندگی سے مایوس ہوگئے۔ حضور علیہ السلام ان کی عیادت کیلئے آئے۔ حضرت

سعد نے کہا میرے پاس کثیر مال ہے اور ایک بیٹی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دو ثلث ، اللہ کی راہ میں خیرات کردوں۔ حضور علیہ السلام نے منع کیا۔ حضرت سعدؓ نے نصف مال کو خیرات کرنے کی اجازت چاہی۔ آپ علیہ السلام نے پھر منع کیا۔ پھر مال کا ایک ثلث خیرات کرنے کی اجازت دی اور فرمایا۔ اگر تم اپنے ورثاء کو دولت مند چھوڑ کر جاؤ تو بہتر ہے۔ بجائے اس کے وہ محتاج ہوں اور لوگوں سے مانگتے پھریں (۵۰)

زندگی میں تو باپ ذمہ دار ہوتا ہی ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ وارثت کے ذریعے مستقبل میں ان کے رزق کا انتظام کرجائے تو زیادہ بہتر ہے۔

لہذا اللہ کی رزاقیت پر یقین اور توکل کا صحیح مفہوم ان احادیث کی روشنی میں متعین کیا جائے کیونکہ ہمارے لئے نمونہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل ہی قرآن کی اصل تفسیر ہے۔

۳۔ تیسرے نمبر پر رزق کی فراہمی حکومت کے ذمہ بھی ہے۔ یعنی کہ وہ صحیح منصوبہ بندی کرے، پیداوار بڑھائے، رعایا کو روزگار اور وسائل کی سہولتیں مہیا کرے اور ان کی غذائی ضروریات کا انتظام کرے۔ مثلاً نہروں کی تعمیر، بنجر زمین کی کاشت صنعت و حرفت کی ترقی اور ملازمت کے مواقع۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے متوقع خشک سالی سے بچنے کیلئے سات سال بیشتر ہی غلہ کو گوداموں میں محفوظ کرنا شروع کردیا اور اس تدبیر سے اہل وطن کو آنے والی آفت سے بچالیا۔ اسی طرح یعقوب علیہ السلام نے قحط سے بچنے کیلئے اپنے بیٹوں کو غلہ لانے کیلئے بار بار مصر کی طرف بھیجا (۵۱) ان دونوں پیغمبروں کا طرز عمل ہمارے لئے مشعل راہ اور توکل کی صحیح تشریح ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور حکومت کا واقعہ ہے کہ ۱۸ھ میں شدید خشک سالی کی بناء پر قحط کی صورت پیدا ہو گئی۔ آپؓ نے حضرت ابو عبیدہ والی شام اور حضرت عمرو بن العاص والی مصر سے غلہ منگوا کر عوام میں تقسیم کیا (۵۲) آپ نے یہ نہیں کہا کہ اللہ رازق ہے اور اسی کی ذمہ داری ہے۔ بلکہ آپ نے خود کو ذمہ دار سمجھا اور اپنے فرائض بھرپور طریقے سے سرانجام دیے۔ لہذا اگر کوئی قوم مستقبل کی پیش بندی نہیں کرتی یا حکومت اپنے وسائل صحیح طریقہ سے استعمال نہیں کرتی اور نتیجے میں قحط پیدا ہوتا ہے تو وہ خود مجرم ہے۔ اس کی ذمہ داری اللہ تعالی پر ڈال کر وہ خود دستبردار نہیں ہوسکتی۔ اس جگہ اللہ کا یہ فرمان خصوصیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے۔ "اللہ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود کو نہ بدلیں۔ (۵۳)

اسی طرح عثمان علیہ السلام کے زمانہ خلافت کا واقعہ ہے کہ سندھ کی فتح پر غور کیا گیا۔ وہاں کے حالات معلوم کرنے کیلئے مخبر بھیجے گئے جنہوں نے واپس آکر رپورٹ دی " پانی کم، پھل ردی، چور بے باک لشکر

کم ہو تو ضائع ہوجائے گا۔ بہت ہو تو بھوکوں مرجائے گا۔ اس رپورٹ کی بناء پر لشکر کشی کا ارادہ ترک کردیا گیا۔(۵۴)

یعنی صحابہ کرام کے زمانہ میں بھوک کی بناء پر ہلاکت کا خطرہ محسوس ہوا۔ پھر نتیجہ کے طور پر مہم کو سرے سے ختم کردیا۔ مگر کسی نے اس عمل کو مندرجہ بالا آیت نحن نرزقکم وایاھم" کے خلاف نہیں سمجھا۔ تو پھر موجودہ دور میں بھی ایسے خطرے کو محسوس کرنا اور اس خطرے کا سد باب کرنا کیونکر غلط ہوسکتا ہے۔

بحث نمبر ۵

کثرت اولاد کی حمایت میں حضرت معقل بن یسارؓ کے ایک واقعے سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ کہ آپ حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہا" مجھے ایک خوبصورت عورت مل رہی ہے مگر وہ بانجھ ہے۔ کیا میں اس سے شادی کرلوں۔ آپ ﷺ نے منع کیا۔ انہوں نے پھر اجازت مانگی ۔ آپ ﷺ نے پھر منع فرمایا۔ تیسری مرتبہ اجازت مانگنے پر بھی آپ نے منع فرمایا اور فرمایا "تزوجواالودود الولود فانی مکاثربکم"(۵۵) بہت محبت کرنے والی اور بہت بچے جنم دینے والی سے شادی کرو۔ میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔ مطلب یہ ہوا کہ اس قسم کی عورت سے شادی کرنی چاہیے اور بچوں کی کثرت ہونی چاہیے۔

بظاہر یہ حدیث اپنے موقف میں کافی واضح اور ٹھوس معلوم ہوتی ہے مگر حدیث کا یہ مفہوم متعدد وجوہ سے توجہ طلب ہے۔ (۱) نکاح کے سلسلے میں حضور ﷺ نے عمومی کلیہ کے طور پر یہ اوصاف بیان کئے ہیں۔ "عورتوں سے شادی چار اوصاف کی بناء پر کی جاتی ہے۔ مال، خاندانی شرافت، حسن وجمال اور دینداری۔ تم دین داری کے ذریعے کامرانی حاصل کرو"(۵۶) اس حدیث میں حضور علیہ السلام نے دین داری کو ترجیح دی۔ دوسرے موقعہ پر کنواری عورت سے شادی کرنے کی ترغیب دلائی(۵۷) معقل بن یسار کی مندرجہ بالا حدیث میں ودود اور ولود کی صفات پیش کیں۔ ان تمام اوصاف وشرائط کی پابندی سے مرد کیلئے شادی کرنا مشکل ہوجائے گا۔ کیونکہ ان صفات کی حامل خواتین بہت کم ہوں گی۔ اسی طرح ان صفات سے محروم عورتوں کیلئے بھی شادی کرنا مشکل ہوگا۔ کیونکہ کوئی مرد انہیں قبول نہیں کرے گا۔ اسلام میں ایسی مشکل اور تنگی پیدا ہوجائے گی جو اسلام کے مزاج اور حضور علیہ السلام کی منشاء کے خلاف ہے۔ لہذا ان تمام احادیث کو مختلف مواقع پر محمول کیا جائے اور معقل بن یسار کی حدیث کو ان کے ساتھ مخصوص کیا جائے تاکہ یہ تضاد اور تنگی پیدا نہ ہو۔

وجہ دوم ۔ مندرجہ بالا حدیث میں ایک صفت ولود بھی ہے۔ بقیہ اوصاف تو پہلے معلوم کئے جا سکتے ہیں لیکن ولود کی صفت تو موجودہ ترقی کے دور میں بھی معلوم نہیں ہو سکتی۔ آخر شادی سے پہلے کسی عورت کے متعلق کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت بچے جنم دے گی۔ اس کا پتہ تو شادی کے بعد ہی لگ سکتا ہے۔ مگر اس وقت حدیث پر عمل نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اب وقت گزر گیا۔ نیز یہ بات معلوم کرنے کیلئے ڈاکٹر کے پاس لے جانا بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ یہ چیز انسانی عظمت واحترام کے خلاف ہے کہ کسی کے ساتھ بھینسوں والا سلوک کیا جائے۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ یہ خاندانی وصف ہوتا ہے اور اس طرح پتہ چل جاتا ہے تو براہ کرم بتلایا جائے کہ آج تک کس خاندان کے متعلق اس صفت کی وضاحت کی گئی ہے کہ اس کی عورتیں بہت بچے جنم دیتی ہیں۔ یا کس عالم اور فقیہ نے شادی سے قبل یہ شرط لگائی کہ ان صفات کی حامل عورت سے شادی ہو گی ورنہ نہیں۔ محض نظریہ پیش کرنا یا تخمینہ لگانا کہ بعض خاندان ایسے ہوتے ہیں بے معنی بات ہے۔ حقیقی اور واقعاتی مثال سے تشریح کریں۔

اصل قصہ یہ ہے کہ حضرت معقل بن یسارؓ اس عورت کے حسن وجمال پر فریفتہ ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتے تھے اور بار بار اس کی اجازت مانگ رہے تھے۔ مگر اس کے عیب یعنی بانجھ پن کو نظر انداز کر رہے تھے۔ جبکہ پیغمبر کی نگاہ حقیقت شناس ہوتی ہے (یعنی حسن وجمال اور اس پر فریفتگی ایک عارضی اور وقتی جذبہ تھا جبکہ بانجھ پن مستقل اور گہرے اثرات کا حامل تھا) کیونکہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے رشتہ ازدواج غیر مستحکم رہتا اور طلاق تک نوبت پہنچتی۔ اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ بانجھ عورت سے شادی نہ کرو بلکہ بچے جنم دینے کی صلاحیت رکھنے والی عورت سے شادی کرو۔

دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس جگہ درحقیقت مغالطہ ہوا ہے کہ لفظ ولود کو مبالغہ کا صیغہ سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ وہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ لہذا اس کا معنی بہت بچے جنم دینے والی" نہیں بلکہ بچے جنم دینے کی صلاحیت رکھنے والی ہے۔ علم صرف کی رو سے فعول کا وزن اسم مبالغہ اور صفت مشبہ دونوں کیلئے آتا ہے (۵۸) اس جگہ صفت مشبہ کا مفہوم ہی مراد ہے۔ دلیل یہ ہے کہ یہ لفظ عقیم کے مقابلے میں آیا ہے۔ جو یقیناً صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ اگر ولود کو مبالغے کا صیغہ بنائیں اور عقیم کو صفت مشبہ کا صیغہ بنائیں تو اس جگہ تقابل درست نہیں رہتا۔ اس کی تائید دوسری حدیث سے ہوتی ہے۔ " امراۃ ولود احب الی اللہ من امراۃ حفاء لا تلد (۵۹) اس میں ولود کا تقابل لا تلد سے ہے یعنی بچے نہ جنم دینے والی۔ نیز یہ ایک عدمی صفت ہے تو اس کا تقابل وجودی صفت سے ہو گا۔ نہ کہ مبالغہ کے صیغہ سے۔ اس وزن کی مزید مثالیں قرآن کریم سے ملاحظہ ہوں:

"ان الانسان خلق هلوعا واذا مسه الشرجزوعا واذا مسه الخير منوعا"(۶۰)
(بیشک انسان کم ہمت پیدا ہوا۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرانے لگتا ہے۔ جب بھلائی پہنچتی ہے تو کنجوس بن جاتا ہے۔ یہ تینوں الفاظ فعول کے وزن پر ہیں اور صفت مشبہ کے صیغے ہیں نہ کہ مبالغہ کے جیسا کہ قرآن مجید کے اردو مترجمین سے واضح ہے کہ انہوں نے ترجمہ میں مبالغہ کا مفہوم اختیار نہیں کیا۔

اس جگہ اشکال ہوسکتا ہے کہ صفت مشبہ میں دوام کا مفہوم ہوتا ہے مگر اس جگہ دوام نہیں۔ جواب یہ ہے کہ اس دوام سے غیر محدود مدت مراد نہیں ہوتی بلکہ لمبا عرصہ مراد ہوتا ہے۔ جسے فطری صلاحیت اور طبعی وصف کے نام سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ دوام کی اس صفت کے اعتبار سے صفت مشبہ کا تقابل اسم فاعل کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ اسم فاعل میں کام کا وجود ایک آن کیلئے ہوتا ہے۔ مثلاً قاتل اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اس میں قتل کا فعل ایک لمحہ کیلئے ہے جبکہ "عدو" بروزن فعول صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ اس میں دشمنی کا وصف لمبی مدت کیلئے ہے۔

نیز معقل بن یسار کی مندرجہ بالا حدیث میں کثرت آبادی کی تلقین محض استحباب کیلئے ہے وجوب کیلئے نہیں کیونکہ نکاح تو بذات خود سنت ہے۔ پھر اولاد کی پیدائش بلکہ بکثرت پیدائش کا حکم کیسے وجوب کیلئے ہوسکتا ہے۔ اس وجہ سے مستحب حکم پر بلاوجہ اصرار کرنا اور اتنا زور دینا کہ وہ واجب معلوم ہونے لگے قطعاً مناسب نہیں۔ حضور ﷺ تو سفر کے موقعہ پر رمضان کے فرضی روزے چھوڑنے کی اجازت دے دیتے تھے(۶۱) پھر مستحب پر اصرار کرنے کی کیا وجہ ہے۔

سابقہ حدیث کا دوسرا حصہ ہے۔ "فانی مکاثر بکم" میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا) یعنی بانجھ عورت سے شادی کرنے کی صورت میں آبادی گھٹے گی اور بچے جنم دینے والی عورت سے شادی کرنے کی صورت میں آبادی بڑھے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر جوڑا آٹھ دس بچے پیدا کرے۔ آخر کثرت کی بھی حد ہوتی ہے۔ لہذا یہ اضافہ دو تین بچوں کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً حضرت شعیب ﷺ اپنی قوم سے فرماتے ہیں "واذکروا اذکنتم قلیلاًفکثرکم"(۶۲) اس وقت کو یاد کرو جب تم قلیل تھے پھر تم کو کثیر بنادیا۔ حالانکہ شعیب ﷺ کی قوم لاکھوں میں نہ تھی پھر بھی اسے کثیر کہا گیا۔ جبکہ حضور ﷺ کی امت کروڑوں میں ہے اور ہر طرح سے کثیر کا مصداق ہے۔

مندرجہ بالا مفہوم کی حامل ایک اور حدیث کو بھی ذہن میں رکھا جائے۔ آپ فرماتے ہیں: انا اکثر الانبیاء تبعا یوم القیامۃ"(۶۳) روز قیامت میرے پیروکار سب سے زیادہ ہوں گے۔ اس حدیث سے

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کثیر الامت ہونے کی بشارت آپ کو دنیامیں ہی مل گئی تھی۔ اس بناء پر معقل بن یساروالی حدیث جس میں زیادہ بچے پیدا کرنے کی ترغیب ہے پہلے دور سے متعلق ہوگی اور یہ حدیث بعد کے زمانہ سے متعلق ہوگی۔ آپ کے کثیر الامت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس قدر طویل دورانیہ آپ کی نبوت کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں کیونکہ آپ قیامت تک کیلئے نبی ہیں۔ اسی طرح مکانی اعتبار سے جو وسعت آپ کی نبوت کو حاصل ہے وہ بھی کسی اور نبی کو میسر نہیں ہوگی کیونکہ پہلے نبیوں کا تعلق کسی مخصوص علاقے سے ہوتا تھا جبکہ آپ ﷺ روئے ارض کیلئے نبی ہیں۔ اس طرح آپ کی امت اور دیگر نبیوں کی امتوں میں عددی فرق کا تناسب ۱۰۰:۱ سے بھی بڑھ جاتا ہے۔

پھر بھی اگر کوئی شخص حضور ﷺ کی امت میں اضافہ کرنے کی شدید خواہش رکھتا ہے تو اس کو چاہیے کہ اسلام کی تبلیغ کے ذریعہ دوسری قوموں کے افراد کو مشرف باسلام کرے۔ بجائے اس کے کہ کسی غریب شخص کو کثیر الاولاد ہونے کی ترغیب دے۔ پھر وہ گنوار اور جاہل رہیں۔ غربت کی وجہ سے صحیح تعلیم وتربیت بھی نہ ہو۔ بقول مفتی محمد شفیع" یہ صورت بھی قتل اولاد کے ضمن میں آتی ہے"(۶۴) نیز یہ خطرہ بھی ہوگا کہ مسلمان گھرانہ میں پیدا ہونے والے جاہل اور غریب بچے عیسائیوں کے ہاتھ لگ جائیں۔ پھر وہ انہیں عیسائی بنالیں۔ جیسا کہ آج کل عیسائی مشنریوں، اداروں اور امدادی ٹیموں کا طریق کار ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اس قسم کی احادیث ترغیبات وفضائل پر مشتمل ہوتی ہیں جبکہ بعض احادیث وقتی تقاضوں، مشوروں اور انفرادی خصوصیتوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی شخص ان احادیث کے ظاہری مفہوم پر ہی مصر ہے تو وہ اس حدیث پر بھی غور کرے تاکہ دوسرا رخ بھی سامنے آجائے۔ "خیرالناس بعدلما متین الخفیف الحاذ الذی لااہل لہ ولا ولد لہ"(۶۵) دوسو سال بعد بہترین لوگ ہلکے پھلکے ہونگے جن کی نہ بیوی ہوگی اور نہ اولاد۔ موجودہ زمانہ میں جو کہ دوسو سال بعد کا زمانہ ہے نیز فتنہ وفساد اور فسق وفجور سے بھی لبریز ہے، یہ حدیث ہمارے حالات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس حدیث پر عمل کرنے کی سب کو ترغیب دینا بھی اسلام کے یک طرفہ پہلو کو پیش کرنا ہوگا۔

بعض افراد کا اعتراض ہے کہ عزل، انفرادی طور پر درست تو ہے مگر حکومتی سطح پر یا اجتماعی طور پر یہ مہم چلانا درست نہیں۔ جواب یہ ہے کہ موجودہ دور اجتماعیت کا دور ہے۔ اب ہر کام اجتماعی طریقہ سے سرانجام دینا پسند کیاجاتا ہے۔ بلکہ روئے ارض کے ممالک میں اجتماعیت پیدا ہورہی ہے اور ادارے وجود میں آرہے ہیں تو پھر اس کام میں اجتماعیت پر اعتراض کیوں۔ اجتماعیت تو کامیابی کا راز

ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انفرادی مسئلہ انفرادی سطح پر حل کیا جاتا ہے مگر جب وہ مسئلہ اجتماعی بن جائے تو ظاہر ہے کہ پھر اسے اجتماعی سطح پر ہی حل کیا جائے گا۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے تو وہ غلہ اور اناج فراہم کرنے کی ذمہ وار ہوتی ہے۔ اگر خوراک کی قلت پیدا ہوجائے تو حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ پھر حکومت کی طرف سے جاری کردہ ان تدابیر پر اعتراض کیونکر صحیح ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ عزل کے سلسلے میں انفرادی اور اجتماعی وسائل کو ملحوظ رکھا جائے۔ وسائل میں اضافہ کی گنجائش نہ ہو تو آبادی کو بڑھنے سے روکا جائے۔ موجودہ دور میں انسان نے بیماریوں، آفتوں اور جنگوں پر قابو پانے کی وجہ سے شرح اموات کم کرلی ہے۔ جس کی وجہ سے آبادی بڑھ گئی اور قدرتی توازن بگڑ گیا۔ اگر شرح اموات گھٹائی ہے تو پھر شرح پیدائش بھی گھٹائی جائے۔ تاکہ توازن برقرار رہے۔ ورنہ ہوسکتا ہے کہ قانون قدرت حرکت میں آئے اور ہزاروں لاکھوں افراد قحط کا شکار ہو کر مرجائیں۔ یا کوئی ملک دوسروں سے قرض اٹھاتا رہے۔ اور پھر معاشی غلامی کے پھندے میں پھنس جائے۔

مراجع ومصادر

۱- القرآن الکریم، سورہ مریم:٦

۲- تفہیم القرآن، ۲:سورہ الاعراف:۸۵

۳- سیوہارزوی، حفظ الرحمن، قصص القرآن، انار کلی لاہور، ۱:۲۷۷

۴- القرآن الکریم، سورہ یوسف

۵- القرآن الکریم، سورہ الکہف:۴٦

٦- القرآن الکریم، سورہ تغابن:۱۵

۷- القرآن الکریم، سورہ الاعراف:۱۸۹

۸- القرآن الکریم، سورہ روم:۲۱

۹- القرآن الکریم، سورہ البقرہ:۲۲۳

۱۰- عثمانی، مولانا شبیر احمد، تفسیر عثمانی، دار التصنیف کراچی، ذیل آیت بالا

۱۱- بخاری محمد بن اسیماعیل، الجامع الصحیح للبخاری، کتاب النکاح

۱۲- القرآن الکریم، سورہ بنی اسرائیل:٦

۱۳- القرآن الکریم، سورہ نوح:۱۲

۱۴- الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات

۱۵- نسائی، ابو عبد الرحمن، احمد بن شعیب، سنن نسائی، کتاب الاستعاذہ

۱٦- ایضاً کتاب الدعوات

۱۷- القرآن الکریم، سورۃ الجمعہ:۱۵

۱۸- القرآن الکریم، سورہ النحل:۱۱۲

۱۹- القرآن الکریم، سورہ السباء:۹

۲۰- القرآن الکریم، سورہ النساء:۳

۲۱- رازی، فخر الدین محمد بن عمر بن حسین، مفاتیح الغیب، مطبع الازہر، قاہرہ، بذیل آیت با

۲۲- مسلم، کتاب الدعوات

۲۳- نووی، ابوذکریا، محی الدین یحی بن شرف، شرح نووی للمسلم، بذیل حدیث بالا

۲۴۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذہ

۲۵۔ ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل بن عمرو، سیرۃ النبویہ (تاریخ ابن کثیر)، ۷:۲۲۱

۲۶۔ غزالی، امام ابو حامد محمد الغزالی، احیاء علوم الدین، طبع عثمانیہ، مصر، ۲، ۳۱

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب النکاح

۲۹۔ ایضاً، کتاب النفقات

۳۰۔ القرآن الکریم، سورہ تکاثر:۱

۳۱۔ القرآن الکریم، سورہ التوبہ:۲۵

۳۲۔ الجامع الصحیح للبخاری، باب العزل

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ ابن قیم، ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر زاد المعاد، نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۷۵ء، ۴:۱۵۴

۳۵۔ شوکانی، محمد بن علی بن محمد، نیل الاوطار، شرکت مکتبہ، مطبع مصطفی البابی، المصر، ۶:۲۲۳

۳۶۔ فتاوی عالم گیری، دار الاشاعت العربیہ، بقندھار، باب نکاح الرقیق۔

۳۷۔ مسلم، کتاب النکاح

۳۸۔ ترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی، ترمذی، باب ماجاء فی العزل

۳۹۔ شفیع، مفتی محمد شفیع کراچی، ضبط ولادت، دار الاشاعت اردو بازار، کراچی، ۱۸

۴۰۔ القرآن الکریم، سورہ بنی اسرائیل:۳۱

۴۱۔ ایضاً، انعام:۱۳۸

۴۲۔ رازی مفاتیح الغیب، بذیل آیت بالا

۴۳۔ حقانی، مولانا عبدالحق، تفسیر حقانی، مطبع غلام علی، لاہور، بذیل آیت بالا

۴۴۔ تاریخ ابن کثیر، ۷:۲۷۵

۴۵۔ القرآن الکریم، سورہ بنی اسرائیل، ۳۱

۴۶۔ ترمذی، باب القیامۃ

۴۷۔ القرآن الکریم، سورہ الجمعہ:۱۱

۴۸۔ تفسیر عثمانی، بذیل سورہ یونس:۳۱

۴۹- الجامع الصحیح للبخاری، کتاب النفقات

۵۰- سنن نسائی، کتاب الوصایا

۵۱- القرآن الکریم، سورہ یوسف

۵۲- طبری، ابو جعفر محمد بن جریر طبری، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۳:۱۲۲

۵۳- القرآن الکریم، سورہ رعد:۱۱

۵۴- بلاذری، احمد بن یحی بن جابر، فتوح البلدان، باب فتح السند، نفیس اکیڈمی کراچی

۵۵- ابن ماجہ، کتاب النکاح

۵۶- ایضاً

۵۷- ایضاً باب ترویج الابکار

۵۸- عبدالباقی، فصول اکبری، فاروقی کتب خانہ، ملتان، ۱۰

۵۹- نیل الاوطار، ۶:۱۱۴

۶۰- القرآن الکریم، سورہ المعارج:۲۱

۶۱- الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الصیام

۶۲- القرآن الکریم، سورہ الاعراف:۸۶

۶۳- احیاء علوم الدین، ۲:۲۲

۶۴- معارف القرآن بذیل سورۃ الانعام، آیت ۱۵۲

۶۵- احیاء علوم الدین، ۲:۲۲